© rasailojaraid.com

تحقیق

واقعہ کربلا اور اس کا پس منظر

ایک نئے مطالعے کی ضرورت

مولانا
عتیق الرحمن
سنبھلی

میں نہ تاریخ کا طالب العلم رہا نہ کسی اور حیثیت سے تاریخ دانی کا دعویٰ۔ مگر میرا احساس بالکل اس نوعیت کا احساس ہے جیسے کسی بدیہی چیز کا احساس ہوتا ہے۔ اور اس نوعیت کے احساسات کو آدمی نہ رد کر سکتا ہے نہ خواہ مخواہ شک کی نگاہ سے دیکھ سکتا ہے۔ میرا احساس یہ ہے کہ ہماری تاریخ کا ایسا نازک حصہ جستدر احتیاط اور جستدر احساس ذمہ داری کے ساتھ قلمبند کئے جانے کی ضرورت تھی اسی قدر بے احتیاطی اور غیر ذمہ داری یہاں کارفرما نظر آتی ہے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو:۔

طبری ج ٦ ص ۲۳۲ پر ایک روایت بتاتی ہے کہ حضرت حسینؓ کربلا میں اترے تو وہ جمعرات کا دن اور محرم سن ٦١ ھ کی دوسری تاریخ تھی۔ پھر ص ۲۳۷ پر ایک روایت آتی ہے کہ جمعرات کا دن اور محرم کی ۹ تاریخ تھی کہ مخالف لشکر کے سالار عمر بن سعد، عبیداللہ ابن زیاد کے ایک فوری حکم کے ماتحت، عصر کے بعد اپنے کیمپ سے اٹھ کر حضرت حسینؓ پر چڑھائی کرنے کیلئے پہنچ گئے۔ مگر پھر مفاہمت ہو گئی۔ اور آئندہ صبح تک کیلئے کارروائی روک دی گئی، ظاہر بات ہے کہ اسکے بعد آئندہ صبح جو آئے گی تو وہ جمعہ کی صبح ہو گی۔ جب ۲ محرم کو بھی جمعرات بتائی گئی۔ پھر ۹ محرم کو بھی جمعرات ہی بتائی گئی تو ۱۰ محرم کو سوائے جمعہ کے اور کوئی دن نہیں ہو سکتا۔ مگر آگے ص ۲۴۰ پر دوسری صبح کو عمر بن سعد کی کارروائی (یعنی اپنے لشکر کو حرکت میں لانے) کا بیان آتا ہے۔ تو ہمیں یہ الفاظ ملتے ہیں کہ:۔

قال فلما صلّی عمر بن سعد الغداۃ یوم السبت وقدبلغنا ایضاً انہ کان یوم الجمعۃ وکان ذالک الیوم یوم عاشوراء خرج فیمن معہ من الناس

راوی کہتا ہے پھر جب ہفتے کو عمر بن سعد نے فجر کی نماز پڑھ لی۔۔۔ اور ہمیں یہ بھی روایت ملی ہے کہ وہ جمعہ کا دن تھا۔۔ اور وہ دن عاشوراء (۱۰ محرم) کا تھا۔ تو ابن سعد اپنے لوگوں کو لے کر نکلا۔

فرمائیے کہ ص ۲۳۲ اور ص ۲۳۷ والی روایتوں کے پس منظر میں جن میں ۲ تاریخ کو جمعرات کا دن اور پھر ۹ تاریخ کو جمعرات کا دن بتایا گیا ہے، کوئی تک اس طور پر ص ۲۴۰ کی اس روایت کو لینے کی ہے جس میں ۱۰ تاریخ کو ہفتے کا دن بتایا گیا ہے؟

ہمیں نہیں معلوم کہ "وقد بلغنا ایضاً" (اور ہمیں یہ بھی روایت ملی ہے کہ یہ جمعہ کا دن تھا) یہ الفاظ طبری کے ہیں، یا راوی کے۔ اگر راوی کے ہیں اور طبری نے کچھ کہا ہی نہیں تب تو کہنا ہی کیا؟ اور اگر راوی کے نہیں طبری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے ہیں، تب بھی ایک مورخ کی ذمہ داری کے لحاظ سے اس انداز کلام کو کوئی ذمہ دارانہ انداز نہیں کہا جا سکتا۔ جس سے ۱۰ محرم کو جمعہ کا دن ایک مشکوک دن بن جاتا ہے۔ حالانکہ گزشتہ بیانات کی رو سے وہ قطعی ہے، کہنے کی بات یہ تھی کہ "یہ دن ہفتے کا نہیں جمعہ کا ہونا چاہیئے۔ اور اگر ہفتہ ہی ثابت ہے تو پھر اگلے دونوں بیانات غلط ہیں۔"

طبری کا اپنا اعتراف

یہ مثال سامنے لا کر ہم طبری کے بارے میں کوئی ایسی بات نہیں کہہ رہے ہیں کہ اگر ان کی زندگی میں کہی جاتی تو شاید وہ کوئی صفائی دے سکتے۔ ان کا خود اپنا اعتراف ہے کہ انکے قاری کو ایسی روایات مل سکتی ہیں جو کسی طرح صحیح نہ ہو سکتی ہوں، جو کسی طرح سمجھ میں نہ آ سکتی ہوں۔ کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ:۔

"میں نے اس کتاب میں جو کچھ ذکر کیا ہے اس میں میرا اعتماد اپنی اطلاعات اور راویوں کے بیانات پر رہا ہے نہ کہ عقل و فکر کے نتائج پر کسی قاری کو اگر میری جمع کردہ خبروں اور روایتوں میں کوئی چیز بایں وجہ ناقابل فہم اور ناقابل قبول نظر آئے کہ نہ اس کی کوئی تک بیٹھتی ہے نہ کوئی معنی بنتے ہیں تو اسے جاننا چاہیئے کہ ہم نے یہ سب اپنی طرف سے نہیں لکھا ہے بلکہ اگلوں سے جو بات ہمیں جس طرح پہنچی ہے ہم نے اسی طرح نقل کر دی ہے۔" (جلد اول ص ۵)

پھر کونسی بات بعید ہے

مورخ کا دامن جب اتنا وسیع ہو کہ اتنی موٹی اور دور سے نظر آنے والی اعجوبگی کے ساتھ بھی، جیسی کہ مذکورہ بالا مثال میں پائی جاتی ہے۔ ایک روایت کو اسکے یہاں بے چون و چرا جگہ مل سکتی ہے۔ تو پھر راویوں کی کونسی غلطی، مبالغہ آرائی یا غلط بیانی رہ جاتی ہے جس کی توقع ہمیں اپنے ان مورخین کی کتابوں میں نہیں کرنی چاہیئے؟ خاص کر کربلا جیسے واقعات میں کہ جن سے جذبات متعلق ہوتے ہیں۔ تعصبات متعلق ہوتے ہیں اور مثبت و منفی مفادات بھی متعلق ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ اس واقعے (واقعہ کربلا) اور اسکے پس منظر کے واقعات کے سلسلے میں جہاں بظاہر صحیح اور قابل قبول روایات موجود ہیں، وہیں نہایت منکر اور ناقابل قبول روایات کا بھی ڈھیر لگ گیا ہے۔ اور فی الواقع یہ صورت پیدا ہو گئی ہے کہ کسی روایت کو صحیح مانتے ہوئے بھی یہ ڈر لگتا ہے کہ گو عقلاً صحیح نظر آتی ہے مگر ہو سکتا ہے کہ واقعہ میں یہ بھی صحیح نہ ہو۔ خاص کر کربلا کے میدان والی روایات میں۔ اور اسی لئے ہم نے اگرچہ کچھ روایات کو عقل، عادت، حالات و ماحول اور دوسرے قابل لحاظ پہلوؤں کی روشنی میں، قابل قبول اور کچھ کو ناقابل قبول ٹھہرایا ہے۔ کچھ کو ترجیح دی ہے اور کچھ کو رد کر دیا ہے، مگر جسکو صحیح ٹھہرایا اور جس کو ترجیح دی اسکو بھی فی الواقع اور سو فیصد صحیح کہنے کی ذمہ داری ہم نہیں اٹھا سکتے۔ جھوٹ اور سچ اور من گھڑت روایات کی وہ آمیزش نظر آتی ہے کہ اللہ کی پناہ۔

کربلا کے واقعے میں غلط بیانی کے اسباب

اور اس کی وجہ وہی ہے کہ کربلا کا سانحہ (چاہے جس شکل میں ہوا ہو) اول تو بجائے خود بہت جذبات انگیز

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے۔ اور پھر اسکے پیچھے سیاسی صف آرائی کی ایک لمبی (کم از کم ۲۵ سالہ) تاریخ ہے جو ناگزیر طور پر دوطرفہ تعصبات کو بھی جنم دے چکی ہے اور مفادات میں دلچسپی رکھنے والے حلقے بھی بنا چکی ہے۔ مزید، کوفیوں کی جس بے وفائی اور غداری نے یہ سانحہ کرایا اسکا بھی تقاضہ ہے کہ (قبائلی رقابتوں کے ماتحت) ایک دوسرے کو الزام دینے اور اپنے آپ کو اندر سے باوفا دکھانے والی روایتیں گھڑی جائیں، خاص کر جبکہ واقعہ کے چند سال بعد ہی یزید کی وفات سے حالات نے ایک دم پلٹا کھالیا تھا۔ اور ان سب باتوں سے اوپر بہت سے راویوں اور مقتل نگاروں کا وہ شیعی جذبہ، جو اگر اس نہایت قیمتی موقع کو ایمانداری کی نذر کر دیتا اور شیعیت کے مفاد کے لئے حسب ضرورت اور حسب استطاعت رنگ آمیزی اور روایت آفرینی کی خدمت انجام نہ دیتا تو یہ ایک غیر فطری بات ہوتی۔ غرض ان مختلف قسم کے محرکات و عوامل نے مل کر واقعہ کربلا اور اس کے پس منظر سے تعلق رکھنے والے واقعات کے بیان میں وہ غضب ڈھایا ہے کہ حقیقت کی بازیافت مشکل بن گئی۔ نہایت بے لاگ طریقے سے روایتوں کا تجزیہ کیا جائے تبھی ممکن ہے کہ صداقت تک رسائی ہوسکے۔

کام مشکل بھی اور ضروری بھی

اس قصے میں صداقت تک رسائی اور اس کا اظہار کسقدر مشکل (یعنی پرخطر) کام ہے۔ اس کا اندازہ کسی اور کو ہو یا نہ ہو، اس راقم کو تو اس وقت سے ہے جب اس موضوع پر ۲۷ سال پہلے والے مضمون میں بغیر یہ جانے ہوئے کہ کسی پوشیدہ صداقت کا اظہار ہوا جارہا ہے، وہ روایت نقل کر دی گئی جس کے مطابق حضرت حسینؓ نے یہ آمادگی ظاہر کی تھی کہ:۔

(واما) ان اضع یدی فی یدیزید بن معاویہ فیری فیما بینی وبینہ رایہ۔

(اوریا) میں یزید کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیدوں پھر وہ جو مناسب سمجھے فیصلہ کرے۔

اوپر عرض کیا جاچکا ہے کہ اس بیان کی بنا پر یہ مضمون بڑا ہنگامہ خیز ہوگیا۔ اور آئندہ ماہ کے الفرقان میں جب پانچ چھ کتابوں کے حوالے سے یہ بیان مدلل کر دیا گیا تب بات قابو میں آئی لیکن وہ بھی صرف سچے علم دوست اور صداقت پسند لوگوں کی حد تک باقی جن لوگوں کے لئے یہ شاعری جزوایمان بن چکی تھی کہ

سر داد و نداد دست در دست یزید

وہ اپنے بے دلیل ایمان پر اس کے بعد بھی قائم اور سرگرداں رہے۔

ایک ناگزیر ضمنی بحث

اگرچہ یہ موقع کسی بحث اور تفصیل کا نہیں ہے تاہم اس اندیشے کے پیش نظر کہ آج کی ان سطروں کو پڑھ کر بھی ایسے تمام حضرات کو گرانی لاحق ہو، اسقدر بات یہاں کہدینا مناسب معلوم ہوتی ہے کہ یزید کے ہاتھ میں ہاتھ دینے اور فیصلہ اس پر چھوڑنے کی بات طبری، ابن اثیر اور البدایہ والنہایہ وغیرہ سب کے صفحات میں اسقدر روشن حقیقت ہے کہ جو لوگ اس کے بیان پر ناراض ہوتے ہیں وہ سچائی سے ناخوش ہونے کے سوا اور کچھ نہیں کرتے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طبری نے اس واقعہ کے سلسلے کی سب سے پہلی روایت یہ دی ہے کہ حضرت حسینؓ نے عمر بن سعد سے ملاقات کی اور کہا کہ دونوں لشکروں کو یہیں کربلا کے میدان میں چھوڑ کر ہم تم دونوں یزید کے پاس چلیں۔ مگر عمر بن سعد نے اس کو قبول کرنے سے عذر کیا، اس کے بعد طبری میں دوسری روایت ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے۔

قال ابومخنف و اما ماحد ثنا بہ المجالد بن سعید و الصقعب بن زھیر الازدی وغیرھما من المحدثین فھو ماعلیہ جماعۃ المحدثین قالو ا انہ قال اختاروا منی خصالا ثلاثا اما ان ارجع الی المکان الذی اقبلت منہ واما ان اضع یدی فی ید یزید بن معاویۃ فیری فیما بینی وبینہ رایہ واما ان تسیّرونی الی ثغر من ثغورالمسلمین شئتم فاکون رجلاً من اہلہ لی مالھم وعلی ماعلیھم۔

ابومخنف نے کہا۔ لیکن مجالد بن سعید اور صقعب بن زہیر وغیرہ محدثین کا قول وہ ہے جو محدثین کی جماعت کا قول ہے وہ کہتے ہیں کہ حضرت حسینؓ نے کہا تھا کہ میری تین باتیں قبول کرلو یا میں اس جگہ کو لوٹ جاؤں جہاں سے آیا ہوں۔ یا یزید کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیدوں پھر وہ میرے اور اپنے معاملے میں جو سمجھے فیصلہ کرے، اور یا تم مجھے مسلمانوں کے کسی سرحدی مقام پر جہاں بھی تم چاہو، پہنچا دو، وہاں میں وہیں کا ایک آدمی ہو کر رہوں گا جیسے وہ سب، ویسا میں۔

سب سے پہلی روایت بھی طبری نے ابومخنف ہی سے لی تھی۔ اور وہ ابومخنف نے ایک فرد واحد ہانی بن ثبیت کے بیان کے طور پر دی تھی، بعد ازاں یہ دوسری روایت دی جس پر وہ محدثین کا اتفاق بتاتا ہے۔ اس کے بعد اسی ابومخنف کی ایک تیسری روایت طبری میں آتی ہے، جو حضرت حسینؓ کے قافلے کے ایک باقی ماندہ فرد اور خاندانی غلام عقبہ بن سمعان کا بیان ہے کہ میں اوّل سے آخر تک آپ کے ساتھ تھا۔ آپ نے کہیں کوئی اس طرح کی بات نہیں فرمائی جو لوگ بیان کرتے ہیں۔ آپ نے تو صرف یہ فرمایا تھا کہ:۔

دعونی فلاذھب فی ھذا الارض العریضۃ حتی ننظرمایصیر امر الناس (ص ۲۳۵)

مجھے چھوڑ دو کہ کہیں بھی اس لمبی چوڑی زمین میں نکل جاؤں حتیٰ کہ یہ بات (صاف ہو کر) سامنے آجائے کہ لوگ کیا فیصلہ کرتے ہیں۔

اور پھر چوتھی روایت اسی ابومخنف سے (دوسری روایت کی تکمیل کے طور پر) ہے کہ عمر بن سعد سے آپ کی ملاقات (جو معاملے کے سلجھاؤ کیلئے آپ نے شروع کی تھی) تین یا چار بار ہوئی۔ اور اسکے نتیجے میں عمر نے ابن زیاد کو خط لکھا کہ اللہ کا شکر ہے معاملات سدھرنے کی صورت نکل آئی ہے اور حسینؓ نے پیش کش کی ہے کہ:۔

ان یرجع الی المکان الذی منہ اتی اوان تسیرہ الی ثغر من ثغور المسلمین شئتنا فیکون رجلاً من المسلمین لہ مالھم وعلیہ ماعلیھم اوان یاتی یزید امیرالمومنین فیضع یدہ فی یدہ فیریٰ فیما بینہ وبینہ رایہ۔

یا تو وہ اسی جگہ کو لوٹ جائیں جہاں سے آئے تھے یا ہم انکو مسلمانوں کے جس کسی سرحدی مقام پر چاہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بھیجدیں اور وہاں وہ ایک عام مسلمان کی طرح رہیں گے، اور یا پھر وہ امیر المومنین یزید کے پاس چلے جائیں اور اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دیدیں۔ پھر وہ ان کے اور اپنے معاملے میں جو مناسب سمجھیں کریں۔

عقبہ بن سمعان کا بیان اگر اس معاملے میں مان لیا جاتا تو اس سے قضیہ کی ایک بڑی گتھی حل ہو سکتی تھی۔ جو عقبہ کے بیان کے برخلاف یہ دوسرا بیان ماننے سے پیدا ہوتی ہے کہ حضرت حسینؓ نے تین باتوں کی پیش کش کی تھی، جن میں سے ایک یہ تھی کہ وہ یزید کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دینے کو تیار ہیں۔ اس بیان کو ماننے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر ابن زیاد کو کیا مصیبت آئی تھی کہ اپنے ہاتھ میں ہاتھ دینے کا مطالبہ کر کے بے ضرورت قتال کی صورت پیدا کی؟ تاریخ کی روایات میں اس کا صرف ایک جواب ملتا ہے کہ شمر بن ذی الجوشن نے چڑھا دیا (طبری ص ۲۲۶) مگر یہ کوئی اطمینان بخش جواب نہیں ہے۔ ابن زیاد کوئی ایسا ہلکا اور سطحی آدمی تو نظر نہیں آتا جو ایسی حماقت کسی کے چڑھانے سے کر لے۔ خاص طور سے جب کہ اسی روایت کا یہ بیان بھی سامنے رکھا جائے کہ عمر بن سعد کے اس خط پر ابن زیاد کا اپنا ردعمل نہایت مسرت اور قبولیت کا تھا۔ بہرحال راقم سطور کی نظر میں اس گتھی کا کوئی معقول اور تشفی بخش حل نہیں ہے۔ البتہ عقبہ بن سمعان کا بیان مان لیا جائے تو پھر سرے سے کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ قتال کی بات بالکل سمجھ میں آتی ہے۔ اور ابن زیاد کیلئے یہ کہنے کا موقع ہوتا ہے کہ "اچھا اب وہ ہاتھ میں آ کر ہمارے ہاتھ سے نکل جانا چاہتے ہیں؟" لیکن اس سہ گانہ پیش کش والی روایت کا پلڑا بھاری ہے اور اتنے شواہد اسکے حق میں پائے جاتے ہیں کہ چاروناچار اسی کو ماننا پڑتا ہے۔ اور عقبہ بن سمعان کی شہادت کے بارے میں وہ کہنا پڑتا ہے جو جسٹس امیر علی مرحوم نے (اپنی شیعیت کے باوجود، مگر معقول پسندی کی بنا پر) لکھا ہے کہ "عقبہ کا یہ انکار شاید اس بنا پر تھا کہ سہ گانہ پیش کش والی روایت میں انکو حضرت حسینؓ کی توہین نظر آتی تھی" (اسپرٹ آف اسلام مطبوعہ ۱۹۷۸ء، دہلی ص ۳۰۱)

اس روایت کے وزن کی سب سے پہلی بات تو ابو مخنف کا یہ بیان ہی ہے کہ "جماعت محدثین کا اس پر اتفاق ہے۔" دوسرے یہ کہ ابو مخنف اور طبری دونوں عقبہ بن سمعان کی بات نقل کرنے کے بعد آگے چوتھی روایت پانچویں روایت اور چھٹی روایت میں مسلسل وہ باتیں بیان کر کے جو سہ گانہ پیش کش کے نتیجے میں پیش آتی چلی گئیں گویا ابن سمعان کی بات کو ناقابل اعتنا قرار دیدیتے ہیں۔ اور تیسری بات یہ ہے کہ ۱۰ تاریخ کے واقعات میں حضرت حسینؓ کے ساتھیوں کی زبان پر ابن سعد اور اسکے ساتھیوں کو خطاب کرتے ہوئے بار بار یہ بات ملتی ہے کہ:-

افمالكم في واحده من الخصال التى عرض عليكم رضى؟

کیا حضرت کی پیش کی ہوئی باتوں میں سے کوئی ایک بھی تم کو قبول نہیں؟

طبری ج ۶ کے صرف ۲ صفحوں (۲۴۴- اور ۲۴۵) میں تین جگہ یہ بات آتی ہے اور اسکے بعد بھی آتی چلی جاتی ہے۔ اس لئے کوئی گنجائش ہی نہیں کہ اس روایت کو نہ مانا جائے۔

اصل بات جو کہنا تھی

یہ ضمنی بات ناگزیر سمجھ کر عرض کی گئی، ورنہ اصل بات یہ کہنی جاری تھی کہ اس قصے میں اصل حقیقت اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صحیح واقعات کی یافت بھی مشکل اور اس سے زیادہ اس کا اظہار مشکل اس لئے کہ اس میں لوگوں کو یا حضرت حسینؓ کی (معاذ اللہ) توہین نظر آتی ہے، اور یا یزید و ابن زیاد کی طرفداری۔ لیکن ہے یہ ایک ضروری کام۔ اس لئے کہ یہ "توہین" نظر آنا اور "طرفداری" نظر آنا، یہ دونوں باتیں ہم سب کی نظروں میں (الاماشاء اللہ) شیعیت کا رنگ آ جانے کا نتیجہ ہے۔ اور یہ رنگ کوئی اچھا رنگ نہیں ہے۔ واقعہ کربلا سے اور جو کچھ ہوا، یا نہ ہوا ہو، شیعیت کو اپنی دوکان چمکانے اور اپنے اثرات پھیلانے کا وہ بے پناہ موقع ملا ہے کہ کچھ کہا نہیں جاتا۔ اور اسی لئے ضرورت ہے کہ نہایت ٹھنڈے دل سے پورے معاملے کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

سنی معاشرے پر شیعیت کے اثرات

میں اور کسی کا کیا کہوں، اپنے والد ماجد کا (اللہ ان کا سایہ مبارک دراز فرمائے) ایک اعتراف اور ایک بیان نقل کرتا ہوں۔

ذی الحجہ ۷۳ھ کے الفرقان میں میرا مضمون واقعہ کربلا شائع ہوا تو والد ماجد لکھنؤ سے باہر کہیں سفر میں تھے۔ میری عادت یہ رہی تھی کہ جو کچھ بھی لکھتا بالعموم ان کو دکھا کر ہی الفرقان میں دیتا تھا۔ مگر یہ مضمون ان کی حالت سفر کی وجہ سے نہیں دکھایا جا سکا تھا۔ واپس آ کر پڑھا تو میرے یہاں تشریف لائے۔ بقول خود بہت غصے میں گھر سے نکلے تھے کہ حضرت حسینؓ کے اقدام کو "بغاوت" سے تعبیر کر دیا۔ اور اس سے بڑھ کر یہ کہ "یزید کے ہاتھ میں ہاتھ دیدینے (یعنی بیعت یا سپردگی منظور کر لینے) کی لغو بات نہ جانے کہاں سے لکھدی! لفظ "بغاوت" کی خلش کے بارے میں تو خود ہی فرمایا کہ وہ آتے آتے راستے ہی میں دور ہو گئی کہ یہ ہمارے فقہاء کے یہاں برا لفظ تھا لیکن آج کل کا ہندوستانی تو اس لفظ کو اپنے یہاں کے آج کے استعمال کے مطابق بولے گا۔ اور آج کے استعمال میں خصوصاً تحریک آزادی ہند کے پس منظر میں، تو یہ لفظ ایک پسندیدہ اور فخر سے بولا جانے والا لفظ ہے نہ کہ کوئی مکروہ و مذموم لفظ، لیکن دوسری خلش باقی رہی اور وہ اس وقت دور ہوئی، جب پانچ چھ کتابوں کے حوالے میں نے پیش کئے جو ایک دوسرا وضاحتی مضمون لکھنے کے لئے جمع کئے گئے تھے۔

یہ بات تو آج سے ۳۷ برس پہلے ہوئی۔ زیر نظر کتاب کا وہ باب جب تیار ہوا اور والد ماجد نے سنا جو "حضرت مغیرہ بن شعبہ اور یزید کی ولی عہدی" کے متعلق ہے، تو بیان فرمایا کہ ہمارے بچپن میں عشرہ محرم میں ہمارے گھر مجلس ہوتی تھی، ہمارے بڑے بھائی صاحب تاریخ ابن خلدون سے حضرت حسینؓ کی شہادت کا بیان سناتے تھے، جس میں حضرت مغیرہ کا ذکر بھی آتا تھا، تو بعض بڑے بوڑھوں کا ان کے متعلق یہ کہنا یاد ہے کہ "ہاں شیرے کی بوند تو مغیرہ ہی نے لگائی تھی،" یعنی فساد کا بیج تو انہوں نے ہی بویا تھا۔ ایک صحابی (اور وہ بھی صاحب فضائل ومناقب صحابی) کے متعلق کس بے تکلفی سے کتنی بڑی بات کہدی جاتی تھی! ..... اور یہ ہمارے وطن سنبھل کے پرانے بڑے بوڑھوں ہی میں نہیں کہدی جاتی تھی، جن کے پاس کوئی خاص علم نہ تھا اور جن کے زمانے تک اس موضوع پر کوئی بڑا اصلاحی کام ہندوستان میں نہ ہوا تھا۔ بلکہ ہمارے زمانے کے ایسے اہل علم تک جن کے متعلق اس طرح کے کسی تبصرے کا خیال بھی ان کے علمی اور تنقیدی مذاق کی بنا پر نہیں کیا جانا چاہیئے تھا۔ ان کے قلم سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہم بعینہ یہی "شیعیت" ٹپکتی ہوئی دیکھتے ہیں۔ یزید کی ولی عہدی کے قضیے میں اس فضول سی روایت پر اعتماد کرتے ہوئے جو کہتی ہے کہ حضرت مغیرہ نے اپنی گورنری بچانے کیلئے یزید کی ولی عہدی کا خواب حضرت معاویہؓ کو دکھایا جو ان کیلئے اتنا خوش کن تھا کہ حضرت مغیرہ سے لی جانی والی گورنری بحال کر دی۔ کس طنزیہ انداز میں لکھا گیا ہے کہ:-

"یزید کی ولی عہدی کے لئے ابتدائی تجویز کسی صحیح جذبے سے نہیں ہوئی تھی، بلکہ ایک بزرگ نے اپنے ذاتی مفاد کیلئے دوسرے بزرگ کے ذاتی مفاد سے اپیل کر کے اس تجویز کو جنم دیا"

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قرابت کا احترام یا عصمت کا عقیدہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت بے شک قابل لحاظ اور واجب الاحترام شے ہے۔ وہ آدمی بد نصیب ہے۔ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابتوں کا لحاظ اور احترام نہ کر سکے۔ لیکن لحاظ و احترام الگ چیز ہے۔ اور معصومین محض کا درجہ کسی کو دینا الگ چیز ہے۔ شیعیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت فاطمہ، حضرت علی اور حضرات حسن و حسین (رضی اللہ عنہم) کو بھی عصمت کے درجے پر فائز کرتی ہے۔ نتیجے میں ان محترم حضرات سے کسی خطا اور بھول چوک کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جبکہ ان سے اختلاف کی صورت میں اختلاف کرنے والا لازماً ہی خطا کار و گنہگار قرار پائے گا۔

ہم اہل سنت بطور عقیدہ یہ بات نہیں مانتے مگر بہت تھوڑے لوگوں کو چھوڑ کر ہمارا عمل اسی ذہنی رویے کی شہادت دیتا ہے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے زمانے سے حضرت عثمان غنی کے زمانے تک کے معاملات میں بعض دوسری اعتقادی قسم کی رکاوٹیں ہمیں اس رویے کے اظہار کی اجازت نہیں دیتیں۔ لیکن اس دور کے ختم ہوتے ہی جو نیا دور شروع ہوتا ہے تو ہمارے اس رویے کے اظہار کا دور بھی شروع ہو جاتا ہے۔ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے اختلاف کی کہانی میں ہم ذرا بھی انصاف پسندی کا مظاہرہ نہیں کرتے، انصاف کے بجائے حضرت معاویہؓ کو بس کچھ رعایت بمشکل دیتے ہیں۔ اگر ہم سچ مچ انصاف پر آمادہ ہو سکتے تو اس قضیے کی صورت ہماری نظروں میں آج بہت کچھ مختلف ہوتی ہم اپنے اس رویے کو کتاب و سنت پر مبنی کچھ اعتقادات سے مربوط کرتے ہیں۔ مگر واقعہ میں اس کا ربط ان شیعی اثرات سے ہے جن سے اہل سنت کا کوئی طبقہ بھی بہ مشکل بچ سکا ہے۔

بے انصافی کی ایک مثال

بے انصافی کی صرف ایک مثال لیجیے۔۔۔۔ اس لئے کہ یہاں اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں نکل سکتی۔۔۔۔ کہ جن تاریخی کتابوں سے ہم حضرت معاویہؓ کی طرف سے حضرت علیؓ پر "سب و شتم" کی روایتیں پاتے ہیں انہیں کتابوں کی شہادت یہ ہے کہ:

وكان على اذا صلى الغداة يقنت فيقول: اللهم العن معاوية وعمراً وابا الاعور و حبيبا وعبدالرحمن بن خالد والضحاك بن قيس والوليد فبلغ ذالک معاوية فكان اذا قنت لعن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

علیا وابن عباس والحسن و الحسین والاشتر۔

اور (واقعہ تحکیم کے بعد) علی جب فجر کی نماز پڑھتے تو قنوت پڑھتے اور کہتے کہ اے اللہ لعنت کر معاویہ پر، عمرو پر ابوالاعور پر، حبیب پر عبدالرحمن بن خالد (بن ولید) پر ضحاک بن قیس پر اور ولید پر۔ پس یہ بات جب معاویہ کو معلوم ہوئی تو وہ بھی جب قنوت کرتے تو علی ابن عباس، حسن، حسین اور اشتر پر لعنت کرتے۔

لیکن اس صاف و صریح بیان کے باوجود ہمیں صرف اتنا یاد ہے کہ معاویہ اور ان کے ساتھی حضرت علیؓ پر سب و شتم کرتے تھے۔ یہ نتیجہ حضرت علی کے اس احترام کا نہیں ہے جو ازروئے کتاب و سنت ہم پر واجب ہے۔ کیونکہ کتاب و سنت بے انصافی نہیں سکھاتی۔ بلکہ اس "احترام" کا نتیجہ ہے جو شیعیت والے عقیدہ معصومیت سے لازم آتا ہے۔ اہل سنت کے اصل مذہب کا تقاضہ تو یہ تھا کہ اگر یہ روایت حضرت علیؓ کے حق میں قابل یقین یا قابل بیان نہیں تھی تو ایسا ہی حضرت معاویہ کے حق میں بھی سمجھا جاتا۔

حضرت علی کے مقابلے میں جیسے کچھ بھی تھے۔ حضرت معاویہ بہر حال ایک صحابی تھے۔ اس لئے ہم اپنے علم کلام کے ماتحت مجبور ہوتے ہیں کہ ان کے ساتھ کچھ رعایت برتیں لیکن جب ان کے بیٹے یزید کا دور آتا ہے تو اسکے اور حضرت حسین بن علیؓ کے معاملے میں ہم میں اور شیعوں میں کوئی فرق باقی نہیں رہ جاتا۔ اس لئے کہ یزید کو ایسا کوئی تحفظ حاصل نہیں تھا۔ جیسا اس کے والد حضرت معاویہ کو حاصل تھا۔ شیعیوں نے "مثلاً" کہا کہ وہ فاسق و فاجر تھا۔ اور کسی طرح اس لائق نہ تھا کہ تخت خلافت پر اس کو جگہ ملتی تو یہ بات چونکہ حضرت حسینؓ کی حمایت میں کہی گئی تھی۔ اس لئے بالکل باسانی ہم نے بھی یہی کہنا شروع کر دیا پھر بعض کو خیال آیا کہ اس سے تو حضرت معاویہ پر بڑا الزام آتا ہے۔ تب یوں کر دیا گیا کہ حضرت معاویہ کی زندگی میں تو وہ ایسا نہیں تھا۔ لیکن بعد میں ہوا۔ حد ہے کہ ابن خلدون جیسا آدمی جس نے یزید کی ولی عہدی کی زبردست وکالت اپنے مقدمہ تاریخ میں کی ہے۔ وہ بھی ذرا سا آگے چل کر جب یزید اور حضرت حسینؓ کے قضیے پر آتا ہے تو ٹھیک یہی بات کہنی شروع کر دیتا ہے۔ یعنی یہ کہ وہ فاسق و فاجر ہو گیا تھا۔ کب ہو گیا تھا؟ اور کب اس بات کا پتہ چلا؟ تاریخ تو کوئی سی بھی اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ ہر جگہ ایک ہی بیان ہے کہ جیسے ہی مدینے کے گورنر نے حضرت حسینؓ کو یہ اطلاع دی کہ حضرت معاویہ انتقال فرما گئے اور ان کے ولی عہد یزید بن معاویہ آپ سے بیعت چاہتے ہیں ویسے ہی حضرت حسینؓ نے مدینہ چھوڑ دینے کا ارادہ فرما لیا اور آنے والی رات میں مع تمام خاندان کے مکے کی راہ لے لی اسکے بعد جب اسکی اطلاع شیعان عراق کو پہنچی تو وہ بھی اپنے مشاورتی جلسے کر کے عازم مکہ ہوئے اور صرف سوا مہینے کی مدت میں یہ مرحلہ آ گیا کہ عراق میں حالات کی جانچ پڑتال اور ضروری پیشگی تیاریوں کے لئے مسلم بن عقیل کوفے کو روانہ کر دیئے گئے تو کیا یہ سمجھا جائے کہ یزید نے تخت خلافت بعد میں سنبھالا والد کے انتقال کی خبر پاتے ہی فسق و فجور کا وہ عالم برپا کیا کہ حضرت معاویہ کے انتقال کی خبر سے پہلے یزید کے فسق و فجور کی خبریں پھیل گئیں؟ حالانکہ سچائی یہ ہے کہ اس بات کیلئے سوا مہینہ بالکل ناکافی تھا، کم از کم ایک سال تو گزرتا "بیچاری مے" کی طرح فسق و فجور مفت میں بدنام ہوا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لکیر کی فقیری یا طلب علم و تحقیق؟

اب ایک طریقہ تو یہ ہے کہ جب ابن خلدون جیسے آدمی نے بھی یہی لکھدیا تو پھر ثبوت ہو یا نہ ہو، سمجھ میں آئے نہ آئے، نہ ماننے کی کیا گنجائش ہے؟ یہ وہ طریقہ اور وہ طرز فکر ہے جس نے سچی بات یہ ہے کہ ہمارا خانہ خراب کیا ہے اور علم کے نام سے جہل قابل فخر بن گیا ہے۔ اگلوں کی توقیر اور تعظیم کے نام پر طلب علم و تحقیق کی راہ بند کرنے والا یہ طرز فکر اگر ہمارے یہاں عام نہ ہوا ہوتا تو ہمارا عالم آج کے عالم سے بہت مختلف ہوتا۔ منجملہ اسکے یہ جو شیعیت ہمارے یہاں اس وقت گھس آئی تھی جب اس نے ایک باقاعدہ متوازی مذہب کی شکل اختیار نہیں کی تھی، یہ بعد کے دور میں قطعی طور سے نکالی جا سکتی تھی، اور نکالدی جاتی اگر طالب علمانہ کی جگہ یہ متصوفانہ ذہنیت ہم پر حاوی نہ ہو چکی ہوتی کہ جو اوپر والوں نے کہدیا وہ حرف آخر اور پتھر کی لکیر ہے۔ اور اس لکیر کی فقیری ہم کو کرنا ہی ہے۔

مے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید

اللہ ہی جانے کہاں سے یہ طرز فکر اس دنیائے اسلام میں آیا جس کا خمیر ہی ذاتی غور و فکر کی دعوت سے اٹھایا گیا تھا اور آباء و اجداد اور رہبان (مشائخ) و احبار (علماء) کی اندھی تقلید کو ضلال و خسران بتایا گیا تھا؟ کھلی ہوئی بات ہے اور ہم بھی جانتے اور مانتے ہیں کہ کوئی آدمی عالم کل نہیں ہوتا۔ پھر ہر ایک کا کچھ نہ کچھ خاص زاویہ نظر ہوتا ہے، ہر ایک اپنے زمانے، اپنے ماحول اور ماحول پر غالب چیزوں سے متاثر ضرور ہوتا ہے۔ اس لئے کوئی کتنا بھی بڑا عالم اور محقق ہو کہیں نہ کہیں ٹھوکر ضرور کھائے گا، کسی نہ کسی لاعلمی یا غلط فہمی کا شکار ضرور ہو گا۔ (الا ماشاء اللہ) اس لئے اگر اسکے احترام کے ساتھ ساتھ علم کے حق کا احترام بھی منظور ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ اسکی باتوں کو تقلیداً لینے کے بجائے تحقیقاً لینے میں کوئی حرج سمجھا جائے اور "خذ ما صفا ودع ما کدر" (جو ٹھیک ہے وہ لے لو، جس میں گڑبڑ ہے وہ چھوڑ دو) کے دانشمندانہ مقولے پر عمل نہ کیا جائے۔ کسی بڑے آدمی کے حوالے ہی کی ضرورت اگر اس کھلی ہوئی بات کو بھی قبول کرنے میں ہو تو حضرت امام مالک کے بارے میں نقل ہوا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا:۔

کل یوخذ منہ ویُردّ علیہ الا صاحب ھذا القبر

سوائے اس قبر والی ذات گرامی کے ہر ایک کا قول جس طرح قابل قبول ہو سکتا ہے قابل رد بھی ہو سکتا ہے۔

ہر انسان کی اس محدودیت اور انفعالیت کے علاوہ ایک دوسری کھلی ہوئی بات یہ ہے کہ کسی گزشتہ زمانے کو ہم اخلاق و کردار اور عادات و اطوار کے لحاظ سے اسکے بعد والے زمانوں کے مقابلے میں خواہ کیسا ہی بہتر سمجھیں مگر وسائل کے معاملے میں ہر بعد والا زمانہ پہلے زمانوں کو پیچھے چھوڑتا آ رہا ہے۔ وسائل علم کا بھی یہی حال ہے کہ وہ برابر ترقی پذیر ہیں۔ کتنے ہی علوم جو اگلی صدیوں میں یا تو مدون نہ تھے، اور مدون ہو گئے تھے، تو انکے مجموعے آسانی سے دستیاب نہ تھے، جبکہ زمانے کی ترقیوں نے انکو اب نہایت منقح شکلوں میں ہر کہہ و مہ کی دسترس میں کر دیا ہے۔ پھر علمی تحقیقات کو آسان بنانے کا فن الگ نئے نئے طریقے اور وسیلے ایجاد کر کے اپنے کرشمے دکھا رہا ہے۔ نتیجے میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نئی علمی تحقیقات کا بھی ایک سلسلہ قائم ہو چکا ہے۔ ایسے حال میں ہمارا علم جوں کا توں اور جمود مطلق کا نمونہ بنا رہے۔ جس معاملے میں جو بیان اگلے لوگ دے گئے تھے، اور جو رائے ظاہر کر گئے تھے، اسے نئے اور بہتر وسائل کی روشنی میں پرکھ کر دیکھنے اور پھر رد کر دینے یا قبول کئے رہنے کا اپنا فیصلہ کرنے کی جرات کے بجائے ہم جوں کے توں اسی رائے پر قائم رہنے میں اور ہر نئی آواز اور نئی رائے سے لڑ جانے میں اپنی سعادت سمجھیں۔ یہ بے شک (حسن نیت کے ساتھ) اخروی سعادت ضرور ہو سکتی ہے۔ مگر دنیوی سعادت کی قیمت پر ہو گی..... اور ہو رہی ہے..... جبکہ ہمارا دین بیک وقت دونوں سعادتوں کا کفیل ہے اور دونوں کی بیک وقت طلب ہی وہ ہمیں سکھاتا ہے۔

دوسرا طریقہ جو ابن خلدون جیسے اہل علم کا اصولاً طریقہ ہے یہ ہے کہ ہمیں اگر حضرت حسینؓ کی زندگی میں یزید کے فسق و فجور کی کوئی معتبر معاصر شہادت نہیں ملتی تو پھر ساری دنیا کہے، بشمول ابن خلدون کہنے، تب بھی اس قول اور بیان کو بس اس پر محمول کرنا چاہیے کہ بعض باتیں اپنی شہرت کی بنا پر اس درجہ یقینی اور قطعی بن جاتی ہیں اور ایک زمانے تک بنی رہتی ہیں کہ انکی واقعیت میں کسی شک اور انکے بارے میں کسی تحقیق کی ضرورت کا سوال ہی ذہن میں نہیں آتا۔ اور یہی چیز اس معاملے میں پیش آئی ہے۔ حضرت حسینؓ جیسی شخصیت کا یزید کے آدمیوں کے ہاتھوں قتل اور پھر شیعہ پروپیگنڈہ مشینری (جس نے پروپیگنڈے کے زور پر حضرت عثمانؓ جیسے عظیم المرتبت صحابی کو ایک کافر و مرتد باور کرا دیا تھا) ان دو چیزوں کی طاقت مل کر یزید کے بارے میں کیا کچھ نہیں باور کرا سکتی تھی؟ اس شہرت کا پردہ جب تک چاک نہ ہوا تھا۔ اور پروپیگنڈے کا سحر ٹوٹا نہ تھا تب تک جس طرح بات چلتی رہی چلتی رہی مگر کیا وجہ ہے کہ ہمیشہ یوں ہی چلتی رہے اور حقیقت کھل جانے پر بھی اسکے ساتھ حقیقت پسندانہ معاملہ نہ کیا جائے؟

مومن کا معیار اور اس کی ذمہ داری

یزید سے ہماری کوئی رشتہ داری نہیں۔ اور اگر ہے تو پہلے حضرت حسینؓ سے ہے۔ حضرت معاویہؓ سے ہماری کوئی رشتہ داری نہیں، اور اگر ہے تو پہلے حضرت علیؓ سے ہے۔ مگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جن کی ذات اقدس کی طرف یہ تمام رشتہ داریاں لوٹتی ہیں انکی مبارک تعلیم نے ہمارا رشتہ سب سے پہلے حق اور صداقت کے ساتھ قائم کر دیا ہے۔ باقی تمام رشتہ داریوں کا درجہ اسکے بعد رکھا ہے۔

یاایھاالذین امنواکونو قوامین بالقسط شھداء للّٰہ ولوعلیٰ انفسکم اوالوالدین والاقربین

اے ایمان والو مضبوط کھڑے ہو انصاف کے ساتھ گواہ بن کر اللہ کے۔ اگرچہ گواہی تمہارے اپنے خلاف ہو یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں کے خلاف ہو۔

یاایھاالذین امنواکونو قوامین لِلّٰہ شھداء بالقسط ولایجرمنکم شنان قوم علی الا تعدلوا اعدلوا ھوا اقرب للتقوی۔

اے ایمان والو کھڑے ہو مضبوط اللہ کیلئے انصاف کے گواہ بن کر۔ اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں بے انصافی پر آمادہ نہ کرے انصاف ... تقوی ... ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسلام کی اس واضح اور صریح تعلیم کو دھیان میں رکھتے ہوئے ہمیں تو اس کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی کہ یزید کیلئے اور حضرت حسینؓ کے لئے ہمارے پاس الگ الگ ترازو اور الگ الگ باٹ ہوں۔

العین تدمع والقلب یحزن ولانقول الا مایرضی بہ ربنا

آنکھوں میں نم ہے اور دل میں غم مگر زبان سے بس وہی کہیں گے جو ہمارے رب کو پسند ہے۔

حضرت حسینؓ اور یزید کے قضیے کا مطالعہ اگر اللہ و رسول کی ان تعلیمات کی روشنی میں اسی اسپرٹ سے کیا جائے جس اسپرٹ سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ایک یہودی ملزم کے ساتھ برابری کی سطح پر اپنے قاضی کی عدالت میں حاضری قبول فرمائی جس اسپرٹ کے ساتھ قاضی نے حضرت علیؓ کے خلاف فیصلہ دیا۔ (اور صرف اس ٹیکنیکل بنیاد پر دیا کہ گواہی کا نصاب (کورم) پورا نہیں ہے اور جس اسپرٹ کے ساتھ حضرت علیؓ نے یہ فیصلہ بے تامل قبول فرمایا۔ انصاف کی اس اسپرٹ کے ساتھ اگر ہم معاملے کو جانچنے کی کوشش کریں۔ تو اس قضیے میں اب تک جو تصور چلا آ رہا ہے۔ اسکے باقی رہنے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ اور اگر واقعی ایک ایماندارانہ اور غیر جانبدارانہ مطالعہ اس تصور اور تاثر کو باقی رکھنے کی اجازت نہیں دیتا جو اس معاملے میں ابتک عام طور سے رہا ہے تو پھر یقیناً یہ ایک ایماندارانہ فریضہ ہے کہ اس مطالعے کو سامنے لایا جائے۔ اور ان تمام حلقوں تک اسے پہنچانے کی امکان بھر سعی کی جائے جو اب تک کے تصور کو ایک ایمانی سعادت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور اسطرح حقائق کے ساتھ بے انصافی جیسی غلط چیز ایمان کا تقاضا بن جاتی ہے۔

اس کام کی ضرورت

ہمیں پورا احساس ہے بلکہ تجربہ ہے جس کا اوپر اظہار ہو چکا ہے کہ ایسے معاملات میں جن کا تعلق نازک قسم کے جذبات سے جڑ گیا ہو ایک صدیوں اور نسلوں سے جمے ہوئے تاثر اور تصور کو چھیڑنا ایک پر خطر کام ہے۔ مزید یہ اس لئے بھی ایک دشوار کام ہے کہ خود اپنے جذبات کی دنیا بھی اس "ایمانداری" کے ہاتھوں جگہ جگہ آزمائش میں پڑتی ہے۔ اس لئے کہ ابتک کا عمومی تصور کچھ نہ کچھ ہم کو بھی ورثے میں ملا ہے۔ مگر یہ معاملہ جیسا کہ اوپر بھی گزر چکا ہے۔ ان معاملات میں سے ہے جنھوں نے ہمارے دینی زاویہ نظر کو مجموعی طور سے بہت متاثر کیا ہے۔ یہ ان معاملات میں سے ہے جن معاملات نے ہمارے اندر ایمانداری اور غیر جانبداری کے شعور کو مدھم کیا ہے، جن معاملات نے انصاف پسندی کی بے لاگ اسلامی روح کو بے جان کر دیا ہے اور حقیقت بینی اور حقیقت پسندی جو اسلام کی سب سے بڑی دین تھی اس سے امت کو بحیثیت مجموعی محروم کیا ہے۔ امت کا ہر حلقہ (خاص طور سے ہر دینی حلقہ) جو آج اپنے آپ کو معیار حق بنائے ہوئے ہے اور اس طرح حق سب سے زیادہ مشتبہ اور متنازعہ چیز بن گئی ہے، یہ ایسے ہی معاملات کا رفتہ رفتہ اثر ہے جن میں انصاف اور حقیقت پسندی جیسے اولین اسلامی اور انسانی تقاضوں کو دوسرے تیسرے اور چوتھے درجے کے تقاضوں سے مغلوب ہو کر قربان کر دیا جاتا رہا۔ ہمارے اندر نئے نئے حلقوں کی پیدائش پرانے حلقوں کے باہمی بعد میں اضافہ اور ان میں سے ہر ایک کے اندر انتشار اور ٹوٹ پھوٹ کے

بقیہ صفحہ ۴۸

© rasailojaraid.com